OPEN ACCESS

Kashf Journal of Multidisciplinary Research

Vol: 02 - Issue 1 (2025)

P-ISSN: 3007-1992 E-ISSN: 3007-200X

https://kjmr.com.pk

منٹو کے افسانوں میں طوائف کی شناخت: ماتحت بیانیہ کے تناظر میں

THE REPRESENTATION OF THE PROSTITUTE IN MANTO'S STORIES IN THE CONTEXT OF SUBALTERN NARRATIVE

تنزیلہ شبیر

(اسکالر، پی ایچ ڈی اردو)

وفاقی اردو یونی ورسٹی اسلام آباد۔

ڈاکٹر زینت افشاں

(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو)

وفاقی اردو یونی ورسٹی اسلام آباد

DOI: https://doi.org/10.71146/kjmr181

Article Info

Abstract

In the context of subaltern narrative, the identity of the courtesan in Manto's stories is a complex and multi-dimensional subject. According to subaltern theory, those individuals or classes who are marginalized or whose voices are silenced do not find a place in the dominant narrative, and they are discussed within a socio-political framework. In Manto's writings, the courtesan is presented as part of a similar suppressed and overlooked class. Manto portrays the courtesan not only as a victim of social stigma and exploitation but also as a human being with emotions and struggles. Courtesans, who are often considered symbols of sin and disgrace by society, emerge in Manto's stories as individuals with sensitivity, pain, and emotional depth. These stories show the lives and challenges of courtesans as part of an oppressed class, trying to find their place in a rigid social structure. Manto presents the identity of courtesans in a way that challenges the notion of them being merely women involved in prostitution. Rather, their existence reflects deep suffering, human emotions and echoes of social injustice. Courtesans in Manto's stories are the subaltern voices that do not find a space in the mainstream social narrative, but Manto, by bringing their stories to the forefront, emphasizes that their identity and experiences are just as important as anyone else's. .

This article is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license https://creativecommons.org/licenses/by/4.0

Keywords: *Prostitute, Subaltern narrative, Marginalization, Survival, Agency, Exploitation, Power dynamics, Morality, Gender, Human dignity. Class. Empathy.*

ماتحت بیانیہ انگریزی لفظ 'Subaltern' کا مترادف ہے۔ 'Subaltern' ایک برطانوی لفظ ہے جس کے تحت sub کو under اور alter کو other کے مساوی متصور کیا جاتا ہے۔ نچلے فوجی عہدے کے کسی شخص، نوکر یا کسان کو سبالٹرن کہا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی کے انگلستان میں جو شخص نچلی یا ماتحت پوزیشن میں کام کرتا تھا، اسے سبالٹرن کہا جاتا تھا۔ Antonio Gramsci نے یہ اصطلاح اپنے مضمون Notes on Italian History میں واضح کی جو Prison Notebook میں شائع ہوئی۔ گارمشی کے خیال میں "سبالٹرن ایک ایسے معاشرے میں مظلوم انڈر کلاس ہے جہاں حکمران اتھارٹی چلاتے ہیں۔"(۱)

ماتحت بیانیہ سماجی، سیاسی، اور جغرافیائی لحاظ سے ایک سامراجی کالونی کی طاقت کی درجہ بندی کرتا ہے۔ انٹونیو گرامشی نے سبالٹرن کی اصطلاح کو ثقافتی بالادستی کی نشاندہی کے لیے متعارف کرایا۔ یہ تصور مخصوص افراد اور سماجی گروہوں کو معاشرتی و اقتصادی اداروں سے باہر کر دیتا ہے تاکہ نوآبادیاتی سیاست میں ان کی حیثیت اور آوازوں کو نظرانداز کیا جا سکے۔ سبالٹرن اور سبالٹرن اسٹڈیز کی اصطلاحات نوآبادیاتی مطالعہ کے بعد کے مطالعاتی ذخیرے میں شامل ہوئی ہیں۔ خاص طور پر مورخین نے سبالٹرن اسٹڈیز گروپ کے کاموں کے ذریعے روایتی سیاسی کرداروں کے مطالعہ کو پس پشت ڈال کر عام لوگوں کے سیاسی کردار کی تلاش کی ہے۔ ۱۹۷۰ کی دہائی میں سبالٹرن کی اصطلاح برصغیر پاک وہند کے نوآبادیاتی لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ سامراجی تاریخ نے مغربی یورپ کے نوآبادیات کے نقطہ نظر کی بجائے نوآبادیاتی لوگوں کے تجربات کو کم اہمیت دی۔ ۱۹۸۰ کی دہائی تک تاریخی تحقیق کو سبالٹرن اسٹڈیز کے طریقوں کے تحت جنوبی ایشیائی تاریخ نگاری پر لاگو کیا گیا۔ سبالٹرن کا غیر مغربی لوگوں (افریقہ، ایشیا، اور مشرق وسطی) کے مطالعے اور مغربی یورپ کے ساتھ ان کے تعلقات کو تاریخی تحقیق کے یوروسینٹرک طریقے کے طور پر زیر بحث لانے کے لیے فکری گفتگو کا طریقہ کار متعارف کرایا گیا۔ پوسٹ کالونیل تھیوری میں سبالٹرن کی اصطلاح نچلے سماجی طبقات اور معاشرے کے حاشیے پر موجود دیگر بے گھر گروہوں کی وضاحت کرتی ہے۔ ایک امپیریل کالونی میں سبالٹرن مقامی مرد و عورت ہوتے ہیں جن کی اپنی کوئی سماجی ایجنسی نہیں ہوتی۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے انتونیو گرامشی (۱۸۹۱-۱۹۳۷) نے مارکسی نظریہ کے تناظر میں استعمال کی۔ گرامشی کے سیاسی نظریے میں یہ ایک نیا تصور تھا۔ نوآبادیاتی نقاد ہومی کے بھابھا نے ذیلی سماجی گروہوں کو مظلوم اور نسلی اقلیتوں کی حیثیت سے بیان کرتے ہوئے سماجی تعلقات کی اہمیت پر زور دیا جن کی موجودگی اکثریتی گروہ کی خودساختہ تعریف کے لیے ضروری تھی تاکہ ان گروہوں کے اقتدار کو چیلنج کیا جا سکے جو بالادست ہیں اور طاقت رکھتے ہیں۔

گارمشی کے بعد ہندوستانی دانشور گائتری اسپیوک نے اس نظریے کو مزید آگے بڑھایا۔ گائتری نے ادبی اور سیاسی تشدد کے مختلف مراحل کی نشاندہی کی اور اس میں مرد و زن کے تعلقات کو بالخصوص موضوع بنایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مغربی دنیا نے محکوم اقوام اور افراد کا کس طرح

استحصال کیا۔اس مسئلے کو گائتری نے اپنے مشہور مضمون "Can the Subaltern Speak"میں مؤثر طور پر پیش کیا۔ حقوقِ نسواں کی علمبردار گائتری چکرورتی اسپیوک نے سبالٹرن کی اصطلاح کے بے جا یاوسیع استعمال کے خطرات پر بھی خبر دار کیا۔ لفظ "سبالٹرن" صرف مظلوم کے لیے حتمی بہترین لفظ نہیں ہے بلکہ مابعد نو آبادیاتی اصطلاح میں ہر وہ چیز جس کی ثقافتی سامراج تک کوئی رسائی نہیں ہے،لوگ جنہیں اپنی تشکیل کردہ نو آبادیاتی ریاستوں کے نظم ونسق میں خاموش کرادیا جاتا ہے،سب سالٹرن ہے۔"(۲)

سبالٹرن مابعد نو آبادیاتی ادب میں ایک مقبول تصور ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ نو آبادیاتی طاقت اور سامراج نے مقامی لوگوں کو پسماندہ اور خاموش کرنے کے لیے بے رحمانہ اقدامات کا استعمال کیا۔ مقامی لوگوں کے ساتھ "عجیب" اور "کمتر لوگوں کے طور پر برتاؤ یوروسینٹرک نظریہ کے تحت ہوتا ہے۔ کالونیل اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ اس گفتگو کا جواب دیتے ہیں جن میں سے ایک سبالٹرن ادب ہے۔ ماتحت بیانیہ کے ماننے والے معاشرے کے باہر احتجاج، مقابلہ کرنے اور کھڑے ہونے کے لیے اپنی آواز بلند کرتے ہیں اور متاثرین کے حقوق، مساوات، انصاف اور شناخت کی وکالت کرتے ہیں۔ مابعد نو آبادیات کی شاخیں جبر، پسماندگی، نچلے طبقے کی محکومیت پر بحث کرتی ہیں۔ محنت کش طبقے، صنفی امتیاز، نظر انداز خواتین، طوائف، غریب طبقات، نسلی ذات پات کی تفریق اس تناظر کے نمایاں پہلو ہیں۔ سبالٹرن کی اصطلاح برصغیر پاک وہند کے نو آبادیاتی لوگوں کو ظاہر کرتی ہے۔

گائتری اسپارک کی نگاہ میں عورتوں کا استحصال نو آبادیاتی مرحلے میں کئی سطحوں پر ہو رہا ہے۔ کسی نو آبادیاتی مرحلے میں پیداوار کے حصے داری کے سلسلے میں سبالٹرن کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس لیے انھیں کچھ کہنے کی اجازت نہیں ملتی، چنانچہ خواتین کی حیثیت ایک سایہ سے زیادہ کچھ نہیں رہی۔ یہ تشدد کی ایک صورت ہے اور تشدد میں ان کی خاموشی کا پہلو کتنا المناک ہو سکتا ہے۔(۳)

مقالہ ہذا میں اردو ادب میں سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں طوائف کے کردار کا ماتحت بیانیہ کے تناظر میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ منٹو نے اپنے ادبی عہد میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے عمدہ ادب تخلیق کیا اور عورت اور جنس کے حوالے سے سماجی کمزوریوں، خامیوں خباثتوں کو بے باکی اور جرات کے ساتھ زندگی کی تلخ روداد کا حصہ بنایا۔ اردو افسانے سے منٹو کو خارج کر دیں تو یکا یک محسوس ہوتا ہے کہ اُردو افسانے کے موضوعات محدود ہیں۔ افسانہ نگار بے باک ہو تو معاشرے کو قبول نہیں اس لیے اکثر کے ہاں کہنے کی اُمنگ ہوتی ہے مگر کہہ دینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ ادب بھی معاشرے کے ان طبقوں سے نفرت کرتا ہے جنہیں خود معاشرے نے نفرت کا حدف بنا رکھا ہے۔ منٹو کا خلق کیا گیا ادب بالکل مختلف تاثر قائم کرتا ہے۔ منٹو کا ادبی مقام اس وقت تک مسلمہ ہے جب تک افسانہ ایک کامیاب صنف ادب کی حیثیت سے زندہ ہے۔ منٹو نے طوائفوں پر چند ایسی کہانیاں لکھی ہیں جس کی مثال نہیں ملتی جن میں کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، پہچان، ہتک،

جانکی، شادر، فوبھا بائی، بر می لڑکی وغیرہ شامل ہیں۔ منٹو نے شروع میں ترقی پسند نظریات کے حامل افسانے لکھے، وقت کے ساتھ ساتھ منٹو کے اسلوب اور تخلیق میں مسلسل نکھار آتا گیا اور ان کی ہر تحریر آنے والے وقت کا ادبی معیار بنتی گئی۔

دنیا بھر کے شعر و ادب میں عورت کے ہجر، وصال، حسن و دلکشی، جمال و جلال کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ یہ عورت عام معاشرتی سطح پر بحیثیت انسان خود کو منوانے کی جنگ لڑتی رہتی ہے۔ وراثت میں حصہ ہو، شادی کر کے اولاد اور بیٹا پیدا کرنا ہو، بے اولادی کے طعنے ہوں، طلاق کا داغ ہو، کردار کی تہمت ہو یا ظلم کے بدلے بیاہے جانے دکھ، نشے کے عادی مرد کے لیے کمانا ہو یا بچوں کی بیڑی پاوں میں ڈالے زیست کا سفر طے کرنا ہو، بیوگی کی چتا میں جلنا ہو یا جیتے جی زندگی سے دستبردار ہونا ہو۔۔ان تمام کاموں کے لیے قدرت اور معاشرے نے عورت کا انتخاب کیا۔ منٹو کے حساس دل نے اس دکھ، درد اور اذیت کو محسوس کیا اور اپنے فن میں سمویا۔ منٹو نے عورت کے ہر رنگ اور روپ کو پیش کیا۔ یہ درست ہے کہ ان کا موضوع زیادہ تر جسم بیچنے والی عورتیں ہیں، انہی عورتوں میں منٹو نے عورت کا ہر رنگ دیکھا، پرکھا، محسوس کیا اور برتا ہے۔ منٹو کے زیادہ تر افسانوں کا موضوع گھروں میں محفوظ عورتیں نہیں ہیں بلکہ سوگندھی جیسی عورتیں ہیں جو اپنی جوانی کا سودا تو کرتی ہیں لیکن دروازے پر دستک دیتے بڑھاپے سے خوفزدہ ہیں:

> "سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جوان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔"(۴)

افسانہ ہتک میں سوگندھی کو سیٹھ کی دھتکار یعنی "اونہہ" سے جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اس افسانہ کو منٹو نے خوبی سے پورٹریٹ کیا ہے۔ سب سے پہلے طوائف سوگندھی کے کمرہ کا نقشہ پیش کیا ہے جہاں ہر شے نہایت معمولی، بے وقعت اور وجود سے خالی ہے۔ دراصل یہ نقشہ کمرہ کا نہیں بلکہ خود سوگندھی کا ہے۔ اس افسانہ میں سوگندھی کو ایک سیٹھ کی ''اونہہ'' سے اٹھانے والی ہتک کا کثیر پہلو بیان ملتا ہے۔ مختلف ناقدین نے اس نسائی شکست وریخت کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ مثلاً عابد علی عابد "اصول انتقاد ادبیات" میں اس افسانہ کا ذکر کرتے ہوئے سوال اٹھاتے ہیں کہ:

> "اگر ایک گاہک نے سوگندھی کو رد کیا تو اس میں اتنی حیرت کی کیا بات تھی اور ایسا کیا خاص نکتہ تھا جس پر یہ افسانہ بنایا گیا۔ سوگندھی ایک چیز بیچتی ہے۔ اگر گاہک کو وہ چیز پسند نہ آئے تو یہ دکاندار کے لیے پریشانی کی بات تو ہوسکتی ہے، تذلیل کی نہیں۔"(۵)

جبکہ وارث علوی اس افسانے کی اصل روح کو سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سوگندھی صرف جنس کا نام نہیں، ایک جیتی جاگتی روح ہے۔اس کے احساسات وجذبات ہیں وہ ہر آنے والے مرد کو پوری وارفتگی کے ساتھ پیار کرتی ہے۔جو مرد اس کا تھوڑا سا بھی خیال رکھتا ہے اس کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتی ہے۔وہ انسان ہے اور ایک عورت ہے،اسے محض ایک بکنے والی چیز تصور کرنا غلطی ہے۔"(٦)

اس افسانہ میں معنی خیز اشارے ہیں اور مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک تصویر بنائی گئی ہے،ایسی عورت کی تصویر جو جذباتی سہاروں سے محروم ہے۔اس کی زندگی اُجاڑ ویران ہے۔اس کو محض ایک بکاؤ مال تصور کرنا فطرت اور جبلت کا انکار ہے۔وارث علوی لکھتے ہیں :

"ہتک میں منٹو ایک ویشیا کی زندگی کی حقیقت کو بیان کرتا ہے لیکن اس حقیقت سے منٹو نے اس لمحہ کو چن لیا ہے جس میں ویشیا کی زندگی کا پورا کرب،بے بسی اور تنہائی پوری شدت سے سمٹ آئی ہے۔یہ سچائی کا وہ لمحہ ہے جسے جاننے کے لیے منٹو نے ویشیا کی زندگی سے معنی خیز حقائق کا انتخاب کیا ہے۔افسانہ کا ہر واقعہ ہی نہیں بلکہ ہر تفصیل،ہر جز واور ہر لفظ صداقت کا بار اٹھائے ہوئے ہے"۔(٧)

منٹو نے جس لمحہ کا انتخاب کیا وہ لمحہ سوگندھی کو ایک عورت،ایک انسان کی حیثیت سے روشناس کراتا ہے۔منٹو کے نسائی کردار استحصال زدہ ہیں اور کسی ایک واقعہ سے ان کی عزت نفس جاگ اٹھتی ہے۔ان کے اندر کی محرومی،گھٹن اپنے کتھارس کے لئے انتقامی جہت کا رخ کرتی ہے۔وہی لمحہ دراصل خود آگہی کا لمحہ ہوتا ہے جس میں ایک کردار اپنی شخصیت کے حقیقی رخ کا اظہار کرتا ہے۔یہاں سوال منٹو کے انتخابِ موضوع و کردار پر ہے کہ آخر منٹو نے معاشرتی استحصال کو دکھانے کے لیے ایسی عورتوں کا انتخاب کیوں کیا جو زمانے بھر کی ٹھکرائی ہوئی ہی نہیں بلکہ گھروں سے بھاگی ہوئی،مردوں کے جال میں پھنسی ہوئی اپنا پیٹ پالنے کے لیے پیشہ پر مجبور ہیں۔دراصل منٹو نے ان عورتوں کے ذریعے اس تہذیبی وتاریخی استحصال کی کہانی بیان کرنا چاہی جو صدیوں سے عورتوں کا مقدر رہے۔وارث علوی کا کہنا بجا ہے کہ :

"منٹو کی حقیقت نگاری طوائف کی تصویر کشی میں اپنے عروج کو پہنچی ہوئی ہے۔کالی شلوار،ہتک،خوشیا اور دس روپے کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اپنی افسانہ نگاری کی ابتدائی منزلوں میں ہی اس نے وہ نظر پیدا کر لی تھی جو تنگ وتاریک کھولی میں بیٹھی لکھیائی کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔طوائف کو اتنی غیر جذباتی اور اتنی دردمندانہ نظر سے دیکھنے والا افسانہ نگار عالمی ادب میں شاید مشکل سے نظر آئے گا۔"(٨)

ابتداء میں منٹو کے ہاں اپنے معاصرین افسانہ نگاروں کے زیر اثر کچھ ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں گاؤں کی بھولی بھالی دوشیزہ شہری بابو کے استحصال کا شکار نظر آتی ہے۔ابتدائی افسانوں میں "شوشو"، "چوہے دان"، "اس کا پتی" اور "میرا اور اس کا انتقام" شامل ہیں۔ان افسانوں میں عورت کا جنسی استحصال تو موضوع

بنایا گیا ہے مگر یہاں وہ گہرا تفکر نہیں جو بعد کے افسانوں میں منٹو کا خاصہ رہا۔ سچا اور کھرا فنکار کبھی بھی کسی نظریہ کا پرچار نہیں کرتا بلکہ وہ ہمارے ذہن کے کچھ حصوں کو اس طرح متحرک کرتا ہے کہ ہم امکانی سطح پر کئی جہات میں سوچ و بچار کر سکیں۔ اسی لیے بڑا فن تبلیغ کا کام نہیں کرتا بلکہ ہماری سوچ کو غذا مہیا کرتا ہے۔ ہم منٹو کو "Feminist" نہیں کہہ سکتے لیکن ان کے موضوعات وہی ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی کہانی لکھ کر اور کسی نظریے کا مبلغ ہوئے بغیر منٹو یہ ترغیب دیتے ہیں کہ عورت کو انسان سمجھیں۔ وہ ان بُری عورتوں کے اندر وہ اچھائی دکھا سکتے ہیں جس کو امکانی سطح پر سوچ کر قاری حیرت سے دم بخود رہ جاتا ہے۔ ''فوبھا بائیا'' اور "ممی" افسانے اس کی بہترین مثال ہیں جن میں عورتیں بیک وقت ماں اور طوائف کا کردار نباہ رہی ہیں۔ فوبھا بائی کا ایک بیٹا جے پور میں ہے جسے وہ ہر ماہ خرچ بھیجتی ہے، خود ملنے جاتی ہے تو اسٹیشن پر اترتے ہی برقعہ اوڑھ لیتی ہے۔ جب ایک دن خبر ملتی ہے کہ اس کا بیٹا مر گیا تو اس کی بے چارگی کا اندازہ اس جملے سے لگایا جا سکتا ہے:

"میری اندھیری زندگی میں صرف ایک دیا تھا، وہ کل خدا نے بجھا دیا۔۔۔۔ بھلا ہو اس کا۔"(۹)

اور پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر دربدر بھیک مانگتی ہے۔ عورت فطرتاً ماں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک طرف ایک طوائف کے اندر ماں ہو سکتی ہے جبکہ دوسری طرف بعض اوقات محفوظ گھروں میں رہنے والی عورتیں مائیں نہیں ہوتیں۔ "ممی" ایک عجیب کردار ہے۔ وہ بیک وقت نائیکہ بھی ہے اور ماں بھی، لڑکیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور دل میں ممتا چھپائے ہوئے ہے۔ آنے والے گاہکوں کے لیے بھی اس کا رویہ یہی ہے۔ یہ کردار بہت طاقتور اور مضبوط ہے اور تادیر قاری پر اپنی گرفت اور اثر جمائے رکھتا ہے۔ منٹو نے عورت کے وہ روپ پیش کئے ہیں جو عام زندگی سے ہٹ کر ہیں۔ "سرکنڈوں کے پیچھے" کی سردار اور "پڑھیے کلمہ" کی رکما ایسے نسوانی کردار ہیں جن سے خوف محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت میں انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے اور یہی اصل نکتہ ہے جس کے علمبردار منٹو ہیں۔ ادب کی بنیاد زندگی کے امکانات کی جستجو پر ہے، یہ اس بات کا تعین کرتا ہے کہ زندگی اور انسان کیسی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ منٹو کے ان بظاہر ناپسندیدہ نسائی کرداروں میں مختلف امکانات پوشیدہ ہیں جو موت اور خوف کی علامت بن کر ابھرتے ہیں اور اکثر یہ احساسات حسد جیسے شدید جذبات سے جنم لیتے ہیں۔ "ٹھنڈا گوشت" کی کلونت کور بھی حسد کی آگ میں جل کر ایشور سنگھ سے انتقام لیتی ہے اور اسے قتل کر دیتی ہے۔

انسانی جذبات میں نفرت، محبت، اور حسد وہ خاص کیفیتیں ہیں جو انفرادی یا اجتماعی صورت میں ہر انسان کے وجود کا حصہ ہیں۔ منٹو کے کرداروں میں پس پردہ ان کیفیات کا تحرک دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں جو خواتین انتقام لیتی نظر آتی ہیں، درحقیقت وہ فطرت اور سماج کے اثرات کی وجہ سے اس راہ پر گامزن ہوئی ہیں۔ "موچنا کی مایا" بھی اسی طرح کا کردار ہے۔ مایا کے جسم پر بے شمار بال ہیں اور اس کی مونچھیں اور داڑھی ہے، پھر بھی موچنا اس کی جانب متوجہ ہے۔ وہ مردوں کو جنسی تسکین فراہم کرتی ہے، مگر اگر اس کی صورت حال پر غور کیا جائے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ اپنی ظاہری بدصورتی کے ساتھ کس طرح سمجھوتا کرتی ہوگی۔ اپنی

فطری بدہیئتی کو وہ گھٹن کے ذریعے نہیں بلکہ انتقام کے ذریعے متوازن کرتی ہے۔ وہ ایک کے بعد ایک مرد کے پاس جاتی ہے اور ان سے ہر ممکن فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ اس کا فطرت سے انتقام ہے۔ لیکن عام قاری اس سے نفرت سی محسوس کرتا ہے۔ کوئی خود میں اس کی بدہیئتی کو رکھ کر نہیں سوچتا، اگر ایسا سوچ سکے تو اسے مایا کے عمل کی وضاحت مل جائے۔

"موذیل" ایک بھرپور اور یادگار افسانہ ہے جس میں قاری کی ملاقات ایک جرات منداور بہادر عورت سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی شخصی آزادی کی قائل ہے اور مختلف مردوں سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ایک سکھ نوجوان ترلوچن کو پسند کرنے لگتی ہے خود پر اس قدر قابو رکھنا جانتی ہے کہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے کے باوجود اسے اپنے دل ودماغ پر سوار نہیں کرتی۔ "شاردا" ایک عام سی عورت کی کہانی ہے جس کی زندگی قسمت کے تھپیڑوں سے بگڑ جاتی ہے۔ وہ ایک مجبور ماں ہے جس کا شوہر شراب نوشی اور بدچلنی میں مبتلا ہے۔ حالات کی سنگینی نے اسے جسم فروشی پر مجبور کیا۔ ابتدا میں وہ اس پیشے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن نذیر نامی گاہک کی اس کے بچے میں غیر معمولی دلچسپی نے اس کے دل کو نرم کر دیا۔ نذیر بتدریج شاردا کے قریب آتا گیا اور وہ اس سے دل وجان سے محبت کرنے لگی۔ نذیر شادی شدہ تھا اور جب اس کی بیوی میکے جاتی، وہ شاردا کو اپنے گھر لے آتا۔ شاردا گھر میں ایک گھریلو عورت کی طرح رہنے لگی، اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی، وہ سب کرتی جو ایک بیوی اپنے شوہر کے لیے کرتی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ نذیر اس سے بیزار ہونے لگا۔ یہاں مرد اور عورت کی فطرت کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ مرد ایک جیسے حالات سے جلد اکتا جاتا ہے، جبکہ عورت کو محبت میں تسلسل اور مستقل مزاجی سے سکون ملتا ہے۔ مرد کی فطرت میں بے چینی اور تبدیلی کی خواہش اسے کسی ایک جگہ اور ایک رشتے میں جڑنے نہیں دیتی جبکہ عورت ایک جگہ اور رشتے کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہوتی ہے۔ آخر کار نذیر اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور شاردا کو حقیقت بتا دیتا ہے۔ شاردا خاموشی سے اپنے بچے کو لے کر چلی جاتی ہے مگر جاتے جاتے نذیر کے پسندیدہ سگریٹ تپائی پر رکھ دیتی ہے۔ اس افسانے کی ساخت میں انسانی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے بڑے مفاہیم اور دلچسپ نکات کو اجاگر کیا گیا ہے جو کہانی کو گہرا اور بامعنی بنا دیتے ہیں۔

انسانی نفسیات واقعی پیچیدہ ہوتی ہے۔ انسان کو وہی حقیقت لگتا ہے جس پر وہ یقین رکھتا ہے اور "زبیدہ" کا یقین اس کی اولاد پر تھا۔ منٹو نے زبیدہ کے اُس لمحے کو محفوظ کر لیا ہے جب وہ حقیقت سے خیالی دنیا کی طرف مڑتی ہے اور اپنی کمی کو اپنی خود ساختہ دنیا کے ذریعے پورا کرنے لگتی ہے۔ مشرقی معاشرے میں دوسروں کو ان کی کمی کوتاہی کا احساس ہر وقت دلایا جاتا ہے۔ یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جو خواتین اولاد سے محروم ہوتی ہیں، دیگر خواتین ان کو اس طرح زیرِ بحث لاتی ہیں جیسے وہ دنیا کی ہر خوشی سے محروم ہوں۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں ان خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک عام بات ہے۔ کوئی نہیں سمجھتا کہ اس میں ان کی کیا غلطی ہے۔ سب انہیں ہی قصوروار سمجھتے ہیں۔ یہ خواتین خود بھی اپنی ذات پر ظلم کرتی ہیں، اس طرح کہ وہ سماجی، معاشی اور اخلاقی دباؤ کے تحت مجرد زندگی گزار نا قبول کر

لیتی ہیں اور خاموش ہو جاتی ہیں۔انسان کو رب نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اپنی ذات پر اس کا حق ہے لیکن اکثر یہ حق وہ صرف معاشرتی دباؤ کے تحت چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔زندگی ہر سطح پر اپنے فطری تقاضوں کا اظہار کرتی ہے۔ان تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے تو محرومیاں جنم لیتی ہیں۔عام طور پر انتہائی غریب اور انتہائی امیر طبقے ان محرومیوں سے کم متاثر ہوتے ہیں۔غریب کو احساس نہیں ہوتا اور امیر کے پاس سد باب ہوتا ہے۔پس یہ محرومیاں زیادہ تر متوسط طبقے کا نصیب بنتی ہیں ۔عزت آبرو کی رکھوالی، "لوگ کیا کہیں گے" کی فکر اسی طبقہ کے مسائل ہیں اور عورتیں اس تندور کا ایندھن ہیں۔کوئی بھی سلگتی روح، جلتے دل و دماغ کو نہیں دیکھتا بلکہ صرف خالی گود نظر آتی ہے۔منٹو کے بے اولاد نسوانی کردار "زبیدہ" جیسی کئی عورتیں ہمارے ارد گرد کا حصہ ہیں۔منٹو کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف وہ جذباتی فنکار بھی ہیں اور دوسری طرف وہ غیر ذاتی یعنی Impersonal شاہد بھی بن جاتے ہیں۔وہ کردار کے ساتھ اس کی زندگی جینے لگتے ہیں۔زبیدہ کی کہانی یوں آگے بڑھتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے لیے ایک بچہ لے آتا ہے۔وہ بچہ اس کے ایک دوست کی ناجائز اولاد ہے۔شوہر وہ بچہ زبیدہ کے پہلو میں لٹا دیتا ہے۔زبیدہ کے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ یہ بچہ ہمارا ہے۔زبیدہ کہتی ہے ہمیں اور اولاد کی کیا ضرورت تھی لیکن چلو شکر ہے کہ اللہ نے عطا کیا۔کہانی کا اختتام کربناک ہے۔جب علم الدین کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ارد گرد خون بکھرا نظر آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ زبیدہ استرے سے اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔علم الدین اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ کیا کر رہی ہو تم؟زبیدہ اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھ کر کہتی ہے:

> "ساری رات بلکتا رہا ہے۔لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا۔۔لعنت ہے ایسی۔۔۔"اس سے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگا دی اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔"(۱۰)

یہ آخری منظر قاری کو سرتا پا لرزا کر رکھ دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ایسی کتنی ہی عورتیں اپنی محرومی میں جلتی کڑھتی زندگی گزار رہی ہیں۔منٹو کے لئے عورت کا ماں بننا کائنات کا سب سے انوکھا اہم اور دلچسپ تجربہ ہے۔جو عورت اولاد سے محروم ہے وہ اتنی ہی غمناک ہے جتنی ایک صاحب اولاد عورت خوش ہو سکتی ہے۔منٹو عورت کی تخلیقی صلاحیت کے معترف ہیں اور اس بنا پر عورت کو مرد سے افضل قرار دینے کے لیے اپنے مخصوص انداز میں افسانہ شاردا میں لکھتے ہیں:

> "ماں بننا کتنا اچھا ہے۔۔اور یہ دودھ۔مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔۔کسی کو پالنا۔اپنے بچے ہی کو سہی کتنی شاندار چیز ہے''۔(۱۱)

افسانہ "سڑک کے کنارے" مختصر مگر پُر اثر افسانہ ہے جو ابتداء ہی سے قاری پر گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ کہانی میں ایک عورت مرد کی جسمانی ضرورت پوری کرنے کے بعد ان الفاظ کو سوچتی ہے جو مرد ان لمحات کے عوض اسے سونپتا ہے، گویا وہ خود کو ان لمحات کا اسیر کر لیتی ہے جبکہ مرد کا حقیقی رویہ اس کے الفاظ کے منافی ہوتا ہے۔ عورت اور مرد کی فطرت کے مابین افتراق کا اندازہ اسی بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مرد کے الفاظ کی بازگشت عورت کے ہاں یوں ملتی ہے:

"اس نے مجھ سے کہا تھا۔۔ تم نے مجھے جو یہ لمحات عطا کیے ہیں یقین جانو میری زندگی ان سے خالی تھی۔ جو خالی جگہیں تم نے آج میری ہستی میں پُر کی ہیں تمہاری شکر گزار ہیں۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید وہ ہمیشہ ادھوری رہتی، میری سمجھ میں نہیں آتا میں تم سے اور کیا کہوں۔۔۔ میری تکمیل ہو گئی ہے۔(۱۲)

یہ کہہ کر وہ ہمیشہ کے لیے جانے لگتا ہے۔ عورت اسے روکنے کی التجا کرتی ہے، سوال کرتی ہے کہ اب وہ اس کے لیے کیوں اہم نہیں رہی۔ وہ پوچھتی ہے کہ جب میرے دل میں محبت کی شدت اب بھی پوری طرح موجود ہے، تو تمہاری طرف سے یہ شدت کیوں ختم ہو گئی؟ مرد کا سرد اور بے رحم جواب ان تمام سوالات اور جذبات کو یکدم ختم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"تمہارے وجود کے جس جس ذرے کی میری ہستی کی تعمیر و تکمیل میں ضرورت تھی، یہ لمحات چن چن کر دیتے رہے۔۔ اب کہ تکمیل ہو گئی ہے تمہارا میرا رشتہ خود بخود ختم ہو گیا ہے۔"(۱۳)

یہ رمزیہ انداز افسانے کا ابتدائیہ ہے جو ہمیں "شاردا" جیسے افسانے میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ نذیر شاردا کے جسمانی خلوص کا دیوانہ ہے، لیکن جب شاردا اپنے جذبات کو لفظوں میں بیان کرتی ہے تو وہ اپنی کشش کھو بیٹھتی ہے۔ اس افسانے میں مرد اور عورت کی نفسیات اور محبت میں ان کے رویے نہایت باریک بینی سے بیان کیے گئے ہیں۔ "سڑک کے کنارے" کا اسلوب دیگر افسانوں سے بالکل جدا ہے جس میں غزل کی سی رمزیت اور ایمائیت پائی جاتی ہے، جو منٹو کے روایتی طرزِ تحریر سے مختلف ہے۔ وارث علوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"سڑک کے کنارے" ایک ایسی نثری نظم ہے جس میں مرد کی بے وفائی، زچگی کی تکلیف، بچہ کے ناجائز ہونے کا غصہ، ایک بچے کو جنم دینے کی بے پایاں مسرت، سب ایک دوسرے میں مدغم ہو کر استعاروں کے جال میں جکڑی ہوئی اور وفورِ جذبات سے پھڑپھڑاتی خود کلامی کا تانا بانا بنتے ہیں۔"(۱۴)

منٹو کو برصغیر کا تخلیقی ضمیر قرار دیتے ہوئے زاہدہ حنا نے منٹو کی کہانیوں کی عورتوں کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے:

"منٹو پسے ہوئے اور پچھڑے ہوئے طبقات کے ادیب تھے اسی لیے عورتیں ان کی تحریروں کا خاص موضوع بنیں اور جب انہوں نے طوائفوں کی کہانیاں لکھیں تو یہ اشرافیہ سے وابستہ ڈیرہ دارنیوں کے رنگین اور دل لبھانے والے قصے نہ تھے۔ ان کی طوائفیں میلی کچیلی، جوؤں سے بھرے ہوئے بالوں والی، سیہ سیہ کپڑوں میں خستہ حالی کا نمونہ تھیں۔ ایک روپے اور آٹھ آنے میں ایک رات کے لیے بک جانے والیوں کا درد جس طرح منٹو نے محسوس کیا اور لکھا، اردو ادب میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔"(۱۵)

جس دلکش اسلوب اور حیرت انگیز انداز میں منٹو نے افسانے کہے، اس فن سے ان کے کئی ہم عصر اور مقابل افسانہ نگار محروم دکھائی دیتے ہیں۔ منٹو کے افسانے آج بھی اس معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہی روتی سسکتی صورتیں ہمارے ارد گرد نظر آتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم منٹو کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ ہم ان سماجی حقائق سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتے جو منٹو کے افسانوں کا خاصا ہیں۔ منٹو مرد افسانہ نگار تھے اس کے باوجود انھوں نے عورتوں کی نفسیات، ان کی داخلی زندگی، جنسی مسائل اور سماجی استحصال کو بڑی ہی باریک بینی اور فنی چابکدستی سے پیش کیا۔ منٹو کی نظر میں عورت طوائف بنتی ہے تو اس کے اندر کی عورت مر نہیں جاتی بلکہ اپنے انسانی تقاضوں اور رویوں کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ماتحت بیانیہ خاص اہمیت کا حامل ہے جس کے تحت وہ سماجی حقیقتوں کو کھل کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانے عموماً انسانی نفسیات، معاشرتی رشتوں اور انسانی درد و کرب کی عکاسی کرتے ہیں۔ منٹو نے اپنی کہانیوں میں انفرادی اور اجتماعی تجربات کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں طوائفیں اکثر ایک ایسے نظام کی نمائندگی کرتی ہیں جو انہیں عدم مساوات، تشدد اور استحصال کے دائرے میں قید کر دیتا ہے۔ وہ ان کی کہانیوں کے ذریعے اس نظام کی ناقابل برداشت حقیقتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ منٹو کی افسانہ نگاری میں طوائفوں کا کردار ماتحت بیانیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانے طوائفوں کی زندگی کی تلخیوں، ان کے خوابوں، اور ان کے احساسات کی گہرائی کو بیان کرتے ہیں۔ منٹو نے طوائفوں کی زندگیوں میں سماجی دباؤ کی عکاسی کی ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کیسے معاشرتی دباؤ اور معاشی مشکلات ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ طوائفیں اکثر اپنی مرضی کے خلاف زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ خود کو بے بسی اور مایوسی کے احساسات میں مبتلا پاتی ہیں۔ پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا یہ پہلو سبالٹرن سٹڈی کے زمرے میں آتا ہے۔

حوالہ جات

ا۔وہاب اشرفی، "مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات"،کتاب محل،الہٰ آباد،۲۰۰۲ء، ص ۱۲۲

۲۔ایضاً، ص ۱۲۴

۳۔ایضاً، ص ۱۳۱

۴۔عابد علی عابد، "اصول انتقاد ادبیات"،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶ء، ص ۵۲۸

۵۔سعادت حسن منٹو، "کلیات منٹو(افسانے)"،(مرتب: امجد طفیل)،بی پی ایچ پرنٹرز،لاہور،۲۰۱۲ء، ص ۱۸۹

۶۔وارث علوی، "منٹو ایک مطالعہ"،الحمرا پبلشرز،اسلام آباد،۲۰۰۳ء، ص ۲۷۶

۷۔ایضاً، ص ۲۶۳

۸۔وارث علوی، "ہندوستانی ادب کے معمار(سعادت حسن منٹو)"،ساہتیہ اکادمی،دہلی،۱۹۹۵ء، ص ۵۰

۹۔منٹو، کلیات منٹو، ص ۲۳۱

۱۰۔ایضاً، ص ۱۵۸

۱۱۔ایضاً، ص ۴۷

۱۲۔ایضاً، ص ۴۲۱

۱۳۔ایضاً، ص ۴۲۱

۱۴۔وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، ص ۱۶۷

۱۵۔کیول دھیر، ڈاکٹر، "منٹو، ادب، عورت اور جنس"،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۳ء، ص ۸

References in Roman Script
1. Wahab Ashrafi, Mabaad Jadeediyat: Muzmirat o Mumkinaat, Kitab Mahal, Illah Abad, 2002, p:122
2.Ibid, p:124
3. Ibid, p:131
4. Abid Ali Abid, Usool e Intiqad e Adabiyat, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2006, p:528
5. Sadat Hassan Manto, Kulliyat-e-Manto (Short Stories), (Compiled by: Murattib Amjad Tufail), BPH Printers Lahore, 2012, p:189
6. Waris Alvi, Manto: Ek Mutala, Alhamra Publishing Islamabad, 2003, p:276
7. Ibid, p:263
8. Waris Alvi, Hindustani Adab ke Me'maar (Saadat Hasan Manto), Sahitya Academy, Delhi, 1995, p:50
9. Manto, Kulliyat-e-Manto, p:231
10. Ibid, p:158
11. Ibid, p: 73
12. Ibid, p: 421
13. Ibid, p:421
14. Waris Alvi, Manto: Ek Mutala, p:167
15. Kewal Dheer, Manto, Adab, Aurat aur Jins, Educational Publishing House, Delhi, 2013, p: 8